دعا کی اہمیت کلامِ اقبال کی روشنی میں

The importance of prayer in the light of Kalam-e-Iqbal

Dr. Naila Abdul Karim
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Mianwali:
nailakarim7@gmail.com

Abstract:
Dua is the praise and praise of Allah, the Most High. In front of Allah, there is need of an expression of humility and reluctance. Dua is the call that rises from the heart of man and reaches the real creator. Dua complements the inner aspects of man and leads to the purification of his intentions. Dua expresses the longing to meet the Beloved. Dua is a kind of mutual message access from Allah Ta'ala. As long as this chain continues As long as this chain continues, the matter is fine. The importance of prayer in every religion and belief is Muslim and the importance of prayer is also clear from Iqbal's speech. The purpose of this article is to highlight it in the light of Iqbal's speech. It is the purpose of this paper to highlight that in the light of Iqbal's words. Several poems of Bang-e-Dara, Bal-e-Jabreel and Zarb-e-Kaleem contain prayer elements. Suqlia, in memory of the late mother, Dua, Tariq's Dua, Dua (Written in the Mosque of Cordoba), Student, Prayer of Slaves, contains prayer elements. Which shows the importance of prayer
Keywords: *Prayer, Religions, Kalam-e-Iqbal, Zarb-e-Kaleem, Bang-e-Dara, Bal-e-Jabreel.*

تمہید

دعا اللہ رب العزت کی تعریف و توصیف ہے۔ اس کی بارگاہ میں عاجزی و انکساری کا اظہار ہے۔ دعا وہ پکار ہے۔ جو انسان کے قلب سے اٹھتی ہے۔ اور خالقِ حقیقی تک پہنچتی ہے۔ دعا انسان کے باطنی پہلوؤں کی تکمیل کرتی ہے۔ اور اس کے ارادوں کی تطہیر کا باعث بنتی ہے۔ دعا محبوب سے ملاقات کے لیے اشتیاق کی ترجمانی کرتی ہے۔ دعا اللہ تعالیٰ سے ایک قسم کی باہمی پیغام رسائی ہے۔ جب تک یہ سلسلہ قائم رہے۔ تب تک معاملہ ٹھیک رہتا ہے۔ ہر مذہب اور عقیدے میں دعا کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اقبال کے کلام سے بھی دعا کی اہمیت واضح ہے۔ جسے کلام اقبال کی روشنی میں اجاگر کرنا اس مقالے کا مقصد ہے۔ بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی

متعدد نظموں میں دعائیہ عناصر شامل ہیں۔ بچے کی دعا، ہمدردی۔ ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، آفتاب، کنارِ راوی، صقلیہ، والدہ مرحومہ کی یاد میں، دعا، طارق کی دعا، دعا (مسجدِ قرطبہ میں لکھی گئی) طالبِ علم، غلاموں کی نماز کے عنوانات کے تحت لکھے گئے کلام میں دعائیہ عناصر شامل ہیں۔ لہٰذا اقبال کے اردو کلام کے تینوں مجموعوں بانگِ درا، بال جبریل اور ضربِ کلیم میں بے شمار دعائیہ اشعار شامل ہیں۔ جن سے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

انسان روحانی اعتبار سے حقیقت مطلق سے اپنا تعلق مضبوط کرنا چاہتا ہے اور دعا ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے بندے کا اپنے رب سے مضبوط تعلق جڑتا ہے۔ بندگی کا یہ تصور ازل سے ہی موجود ہے۔ اور بے شمار انسانی ترقی بھی اس تصور کو ختم نہیں کر سکی۔ کامیابی ہو یا ناکامی، دکھ ہو یا غم، امن ہو یا جنگ اور آسودگی ہو یا نا آسودگی غرض ہر حال میں انسان بنا کسی تردد کے دعا کا سہارا لیتا ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق دعا کا مفہوم:

" اللہ تعالیٰ سے استمداد و استغاثہ ہے۔ اپنے یا کسی حق میں (ل) یا کسی کے خلاف (علٰی) تہلیل و تحمید کو بھی دعا کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ سے جزا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔"[1]

دعا کے اصطلاحی معنی ہیں۔ خدا کی طرف رجوع کرنا، اور عاجزی کے ساتھ اس سے کوئی چیز طلب کرنا جبکہ شریعت کی رو سے دعا کا مطلب یہ ہے کہ "خداوند تعالیٰ سے گفتگو کرنا، اس کی حمد و ثنا کے ساتھ اس سے مغفرت و رحمت کی درخواست کرنا، یا دنیاوی حاجات کی بر آوری کی درخواست کرنا۔"[2] پیدائش آدم سے ہی انسانی ذہن میں تصورِ دعا موجود رہا ہے۔ مذہب کے بغیر انسانی طاقت روحانی اور مادی اعتبار سے مضبوط نہیں ہو سکتی ہر مذہب میں اللہ کی عبادت کا مضبوط تصور موجود ہے۔ عبادت روح کی غذا ہے۔ جو نہ صرف دل و نگاہ کی صفائی کا سبب بنتی ہے۔ بلکہ سماجی ترقی کا وسیلہ بھی بنتی ہے۔ مذہبی تصور ہر مذہب اور عقیدے میں مشترک ہے تاہم نسل انسانی میں مذہبی عبادت کا ایک مخصوص انداز موجود ہے اور ہر عباداتی انداز میں دعا کی حیثیت مشترک ہے۔ اسی لیے تمام مذاہب میں تصور دعا

---

[1] سید، عبداللہ، ڈاکٹر، امجد الطاف و دیگر (مرتبین) اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد نہم، طبع دوم، دانش گاہ پنجاب، لاہور، 1986، ص339

[2] ایضاً

موجود ہے۔ انسانی پیدائش سے ہی دعا مانگنے کے تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ دینی و دنیاوی امور کی انجام دہی کے لیے دعا مانگی جاتی ہے ۔اور یوں دعا کا تصور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تمام مذاہب میں ہے۔ عالمی مذاہب میں تصور دعا کو سمجھنے کے لیے کچھ مذاہب کا ذکر ضروری ہے۔ جیسے ہندومت اور یہودیت و عیسائیت وغیرہ ۔ہندومت کا آغاز کسی ایک شخص سے نہیں ہوتا۔ زرتشت و عیسیٰؑ کی طرح ایک ایسی ہستی نہیں جس کو ہندوؤں کا رہنما کہا جاسکے ۔ایسے ہی ہندوؤں کی یکسانیت نہیں ملتی عقائد کی گوناگوں طریق عبادت کے اختلافات اور معبودوں کی کثرت کے باعث یہ مذہب ایک گنجان جنگل کی طرح معلوم ہوتا ہے ۔جس میں ہزاروں راستے نکلتے ہوں لیکن کوئی راستہ صاف اور سیدھا نہ ہو۔ ۲ یہودیوں کے عہد نامہ قدیم میں خدا کا تصور توحید کا حامل ہے۔ مگر یہودیت طریقہ کار میں انسانی ذہن نے بھی تھوڑی سی ترقی کی تھی تو ان کے ہاں خدائی تصور مجسم انداز میں ہی تھا۔ عہد نامہ عتیق میں ایسے شواہد بے شمار موجود ہیں۔ جن میں انسانی خصوصیات واضح ملتی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنے کی خواہش کی تو جواب ملا جسکا مفہوم کچھ یوں ہے۔

"تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہے گا۔ پھر خداوند نے کہا دیکھ میرے قریب ہی ایک جگہ ہے۔ سو تو اس چٹان پر کھڑا ہو۔ اور جب تک میرا اجلال گزر تا رہے گا۔ میں تجھے اس چٹان کے شگاف میں رکھوں گا اور جب تک میں نکل نہ جاؤں۔ تجھے اپنے ہاتھ سے ڈھانپے رکھونگا۔ اس کے بعد میں اپنا ہاتھ اٹھالوں گا۔ اور تو میرا پیچھا دیکھے گا۔ لیکن میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا۔[3]

یہودیت میں ایمان کے بجائے اعمال کی اہمیت زیادہ ہے ۔یہودیت میں دعا کا ایک خاص انداز ہے جس کے مطابق ایک اہم وقت پر دعا مانگی جاتی ہے خوشی کا موقع ہو یا غم کی حالت ہو دعا کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے بیماری کی حالت میں گناہوں سے توبہ کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ اسی طرح تندرست ہونے پر اللہ کا شکر بجالانے کے لیے بھی دعا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی بیماری سے شفا نہیں ہو رہی یا بے یقینی کی کیفیت ہو تو اجتماعی دعا

[3] کتابِ-"مقدس، خروج"-24-21-36، بائبل سوسائٹی، لاہور، 1999، ص86

کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اور کتاب مقدس پڑھ کے دعا مانگی جاتی ہے اور ان فرائض کو اس قدر اہم مانا جاتا ہے کہ ان کے لیے باقاعدہ انتظام ہوتا ہے۔

"قومی مجلس کے چار نمائندے مریض کے کمرے میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اور جب تک مردے کی تجہیز و تکفین نہیں ہو جاتی۔ وہ اس جگہ سے نہیں ہلتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔ والدین کے انتقال کے بعد سے گیارہ ماہ تک اولاد کو صبح و شام ایک خاص دعا قدیش کہلاتی ہے پڑھنا ہوتی ہے"۔[4]

یہودیت میں دعا کی حیثیت مسلم ہے۔ کیونکہ اُسی کے ذریعے خدا سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ عیسائیت مذہب اپنی حیثیت کا تعلق سونے سے جوڑتا ہے اور وہ خود کو خدا کا انتخاب سمجھتے ہیں اس لیے عیسائیت میں بھی دعا کو عبادت کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ عبادت میں ثنا اہم حصہ ہے جس کے عہد نامہ جدید میں ان گنت ثبوت دعائیہ اشکال میں موجود رہے۔ قدیم عہد نامے میں زبور کو اہم مانا جاتا ہے اور عہد نامہ میں بہت سی دعائیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں تمام ضروری لوازمات کا اندارج بھی موجود ہے۔ کیونکہ مسیحیت کے مطابق دعا محض دکھانے کی چیز نہیں بلکہ دعا کا مقصد ربّ بزرگ و برتر کی بارگاہ میں عاجزانہ التجا ہے۔ دعا ہر مذہب کا ایک اہم حصہ ہے انسان بے قراری کی حالت میں اطمینان قلب کے لیے دعا کا سہارا لیتا ہے۔ بے حسی کی حالت میں جب وہ رب بزرگ و برتر کو یاد کرتا ہے تو اسی کو دعا کہتے ہیں۔ عیسائیت میں ایک اہم نکتہ توجہ طلب ہوتا ہے کہ ّرب تعالیٰ کے کلام میں بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ اپنے پیروکاروں کو تبلیغی انداز کے بارے میں بتایا ہو۔ البتہ خدائے بزرگ و برتر نے دعا کرنے کا سلیقہ ضرور بتایا ہے جس کا حوالہ کچھ یوں ملتا ہے۔

"جب تم دعا کرو تو کہو، اے رب تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے، ہماری روز کی روٹی ہمیں روز دیا کر اور ہمارے گناہ معاف کر، کیونکہ ہم بھی اپنے ہر قرض دار کو معاف کرتے ہیں۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا"۔[5]

---

[4] رشید احمد "تاریخ مذاہب" قلات پبلشرز، کوئٹہ، 1979، ص، 290

[5] کتاب مقدس، زبور-2-11-2، ص، 86

قرآن میں جہاں بہت سے واقعات کا ذکر ہے۔ وہاں بہت سی دعائیں بھی موجود ہیں۔ اور یہ دعائیں ہماری توجہ اس جانب مبذول کرواتی ہیں کہ ہمیں اپنی التجائیں بارگاہ الٰہی میں پیش کرنی ہیں۔ اوراسی کتاب میں ہماری دعاؤں کے قبول کرنے کا بھی فرمان ملتا ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالی نے دعا کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ اس نے قرآن مجید کی پہلی سورت میں نہایت خوبصورت اور بڑے واضح انداز میں پیغام دیا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ فاتحہ میں کچھ یوں فرماتے ہیں:

"شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ بدلے کے دن کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تونے انعام کیا۔ ان کی نہیں۔ جن پر غضب کیا گیا۔ اور نہ گمراہوں کی۔"[6]

لہذا اس تمام مذہبی مطالعے سے یہ بات اخذ ہوئی ہے کہ نظریاتی اختلافات کے باوجود تمام بنی نوح انسان اس نظریے پر اتفاق رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کی آہ کو سننے والا ہے اور اپنی آہ و پکار سنانے کے لیے اسے پکار ناہی دعا ہے اللہ کے قریب ہونے کے لیے عبادت کے بعد دعا بہترین ذریعہ ہے اور دعا میں وہ تمام اقوال اور افعال شامل ہیں جو اللہ کی خوشنودی کا باعث ہیں۔ پختہ یقین دعا کے لیے عبادت میں مثبت کردار کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ دعا خدائے بزرگ وبرتر کی طرف رجوع اس کی عبادت اور انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

(مریم سے فرمایا) "اُس دوران اپنے رب کو پکارنا اور ہر وقت اُسی کی پاکی بیان کرتے رہنا"[7]

اللہ سے قرب انسانی شخصیت میں امن وسکون کا باعث بنتا ہے اس سے اعصابی تناؤ سے چھٹکارا ملتا ہے اور بے چینی ختم ہوتی ہے اور بلخصوص جب انسان کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ مشکل چاہے کتنی بڑی ہو لیکن وہ

---

[6] ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا، تفہیم القرآن، جلد اول، ص،250

[7] ایضا، س:280

ایک ایسی قوت سے وابستہ ہے جس پر مکمل اعتماد اور یقین اس کو پریشانی سے یقیناً نجات دلا سکتا ہے۔ بے شک اپنی ذات کو اللہ کے حصارِ محبت میں دینا ہی کامیابی کی کنجی ہے اور اس کے بغیر زندگی کا جو بن برقرار نہیں رکھا جا سکتا ۔ جس کا اظہار کچھ یوں ملتا ہے:

"مذہب سے مراد سچائی کو ماننا اور حقیقی تجربے سے آشنا ہونا ہے ایسی صورت میں فکری مباحث کا ادراک ضروری ہے۔ اور اپنی ذات کو مکمل کرنے کے لیے ایسی کوشش کرنی پڑتی ہے جسے دعا کہتے ہیں۔"[8]

علامہ اقبال کو فلسفیانہ نظریات سے گہری وابستگی تھی ان کا پی، ایچ، ڈی کا مقالہ فارسی میں مابعد الطبیعات کے موضوع پر مشتمل تھا اس کے علاوہ ان کے سات" خطبات کا مجموعہ " تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ان سات خطبات میں دعا کا ذکر ہے۔ اقبال کے ہاں فطری حکمت کو جاننے کے لیے اور اپنی ذات کی تکمیل کے لیے دعا ہی بہترین ذریعہ ہے۔ اصل میں علم کا حصول جس انداز سے بھی کیا جائے وہ عبادت کا ہی پہلو ہے اور اس کے لیے ایک صوفی عرفان حاصل کرنے کے لیے سلوک کی منزلیں طے کرتا ہے۔ علامہ اقبال جدید دور کے ایک اہم شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد اسلامی فکر پر مبنی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مسلمانوں کی پریشان صورت کو دیکھ کر کرب محسوس کرتے تھے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کی خوشحالی کے آرزومند تھے۔ ان کا نقطہ نظر اسلامی تعلیم تھا ان کی فکر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ تھی۔

علامہ اقبال کی زندگی کا معمول علی الصبح اٹھنا اور تلاوت قرآن کرنا جیسی خوبیوں سے مزین تھا۔ ان کی زندگی کے ابتدائی تصورات ان کی بیاض میں ملتے ہیں۔ اقبال کو خدا سے حقیقی محبت تھی۔ اس لیے وہ دعا کو معرفت الٰہی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال کے مطابق اپنی تمام امیدیں اور آرزوئیں صرف اور صرف اللہ سے وابستہ کرنی چاہیں۔ علامہ اقبال کو بھی اللہ تعالی پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ اپنی ذاتی خواہشات کے لیے کبھی کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ علامہ اقبال دعائیہ اثرات کے قائل تھے ان کے مطابق دعا صرف اطمینان دل کا

---

[8] نائیلہ انجم "جدید اردو نظم میں تصورِ دعا" جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2010، ص25

نام نہیں بلکہ اس سے بے شمار انسانی مسائل کا حل ممکن ہے۔اور سیرت و کردار کی بہتری میں دعا کا بہت عمل دخل ہے۔انہوں نے سرسید احمد خان کے رسالے "الدعاوالاستجالہ" میں دعا کے حوالے سے درج تصور کو اپنے تصور سے مختلف پاتے ہوئے تنقید کی۔علامہ اقبال جہاں انفرادی دعا کی اہمیت گردانتے وہاں علامہ اقبال کی دعائیں اشعار کی شکل میں بھی موجود ہیں۔ان کی کتاب "بانگ درا" اردو شاعری کی رنگا رنگی سے مزین ہے۔"بانگ درا" اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے جسے مرتب کرتے وقت انہوں نے بہت سی نظمیں ،غزلیں یا اشعار اس وجہ سے قلمزد کر دیئے کہ وہ ان کے نزدیک معیاری نہ تھے لیکن اس میں " طلوع اسلام" تک ان کی وہ تمام نظمیں اور غزلیں آئی ہیں جنہیں انہوں نے فکر و بیان کے لحاظ سے معیاری سمجھا اور جو اکثر ہزاروں لوگوں نے خود مرحوم کی زبان سے سنیں، یا وہ مختلف رسالوں اور اخباروں میں چھپ کر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھیں۔ان میں سے بہت سے اشعار بچوں ،جوانوں اور بوڑھوں کی زبانوں پر تھے انہی نظموں سے ان کی شہرت ہوئی۔۔"بانگ درا" کو آج بھی اقبال کی تصانیف میں مختلف وجوہ سے امتیاز کا ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب بانگِ درا کی نظم میں دعائیہ کلمات کچھ یوں واضح کیے:

"زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے

میرے اللہ! ہر برائی سے بچانا مجھ کو
نیک
جو راہ ہے اس راہ پہ چلانا مجھ کو "[9]

[9] اقبال، "بانگِ درا" چوتھا ایڈیشن، کتب خانہ حمیدیہ حویلی، نئی دہلی، 1990، ص، 18

میری آرزو اور خواہش اس دعا کی صورت میں میرے لبوں پر آرہی ہے۔ کہ اے خدا! میری زندگی شمع کی صورت ہو۔ میرے دم سے دنیا کا اندھیرا دور ہو جائے میرے اللہ! تو مجھے برائیوں سے بچائیو اور جو نیک ہدایت کا راستہ ہے اس پر مجھے چلائیو کیونکہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی ٹھیک راہ پر چلنا ہے اسی طرح اقبال اپنی ایک نظم آفتاب میں بھی دعائیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور اللہ کی تعریف بیان کرنے کے بعد دعا گو ہیں۔ کہ اے خالق کائنات! تو دنیا کا روحِ رواں ہے، تجھ پر حیات انسانی کا دار و مدار ہے۔ اور کائنات کی کتاب کا شیرازہ بند ہے۔ کائنات کے اجزا کو انتشار سے محفوظ اور مرتب رکھنے والا ہے۔ وہ آفتاب جس کے باعث دنیا میں روشنی پھیلی ہے یا پھیل سکتی ہے وہ دل ہے، خرد ہے، روح رواں ہے اور فہم و شعور ہے۔ لہذا اے خالق کائنات تو ہمیں فہم و شعور کی روشنی عطا فرما اور عقل و خرد کی آنکھوں کو اپنی تجلی سے نور عطا فرما۔ ہم انسان صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بن کر اس کائنات کی مختلف تاریکوں کو دور کر سکیں اور اس کی رونق کا سامان کر سکیں۔ تو ہی اس وجود کی محفل (کائنات) کا منتظم ہے۔ اور نشیب و فراز کے رہنے والوں کا خدا ہے۔ زمین و آسمان کے رہنے والوں کا خالق و مالک تو ہی ہے۔ اور کائنات کی ساری رونق کا سامان تو ہی ہے۔ لہٰذا اقبال کی نظم آفتاب میں اقبال کے انہی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے:

اے آفتاب! روح و روان جہاں ہے تو
شیرازہ بند دفتر کون و مکان ہے تو
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روح ہے، شعور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفل وجود کا سامان طراز تو

یزدان ساکنان نشیب و فراز تو[10]

اقبال کی نظم صقلیہ میں بھی دعا کی اہمیت واضح ہے۔ اقبال کی یہ نظم ان خیالات و جذبات کا نتیجہ تھی ۔جو جزیرہ سسلی کی شمعیں دیکھ کر اس وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوئے کہ کبھی سسلی پر اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا اور یہاں سے اسلامی علوم و فنون یورپ پہنچ رہے تھے اب مدت ہوئی وہ دور ختم ہو گیا۔ عرب اپنی عظمت لوٹا کر پھر صحرا میں جا بیٹھے ،لہذا سسلی ان کی تہذیب کا مزار بن کر رہ گیا۔ یہاں ایک زمانے میں ان بیانیوں کا ہنگامہ بپا تھا جن کی کشتیاں سمندر کے سینے پر کھلتی پھرتی تھیں یعنی سمندر ان کے لیے کھیل کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ بیابانی جن کی وجہ سے شہنشاہوں کے درباروں میں ہلچل مچ جاتی تھی اور ہر شخص پر لرزہ تاری ہو جاتا تھا۔ وہ تلواریں میان سے باہر نکالتے تھے تو ان سے ہر طرف بجلیاں گرتیں تھیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے سسل! تیری وجہ سے سمندر کی شان قائم ہے تجھے پانی کے اس وسیع بیابان میں راستہ دکھانے والے کی حیثیت حاصل تھی۔ میری دعا ہے کہ تو سمندر کے رخسار پر تل کی طرح زیب و زینت کا سامان بنا رہے اور سفر کرنے والے کو تیری شمعیں تسلی دیتی رہیں۔ سسل کو سمندر کے رخسار کا تل اس لیے کہا کہ بحرہ روم کے وسیع پانیوں میں جزیرے کو واقعی وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو رخسار پر تل کو۔ میری دعا ہے کہ تیرا نظارہ مسافر کی آنکھ کے لیے پر لطف رہے اور سمندر کی موجیں تیرے ساحل کی چٹانوں پر رقص کرتی رہیں۔

میں یہ دعائیں اس لیے دیتا ہوں کہ تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا سرچشمہ اور مرکز تھا۔ جس کا دنیا کو روشن کرنے والا حسن آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتا تھا۔ اقبال ہر دم مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں جا بجا مسلمانوں کے زوال کی داستان کا ذکر ملتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر دم اللہ کے حضور دعا گو ہیں۔ کہ اللہ انہیں اپنی شانِ کریمی سے نوازے۔

[10] ایضا، ص،25

وہ اپنی ایک نظم "دعا" میں بھی مسلم امہ کے دل کی درستی کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ جو کچھ اس طرح سے ہے:

رب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے یا
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے [11]

اے خدا! مسلمان کے دل کو وہ زندہ آرزو بخش جس سے دل میں حرارت پیدا ہو جائے اور روح تڑپ اٹھے۔

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سر پیرہن نہیں ہے [12]

اے خدا! مبارک قدم والی عقل کو تھوڑا سا جنون سکھا دے۔ اے تو لباس کے سینے کا خبط ہے لیکن مجھے سرے سے لباس ہی کا ہوش نہیں۔ یعنی مجھے دنیا کے کاروبار کی طرف مائل کر رہی ہے۔

بالِ جبریل علامہ اقبال کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جو "پیام مشرق" کے بعد شائع ہوا۔ پہلے اس کا نام "نشان منزل" تجویز ہوا، اور مسودے کے سرورق پر لکھ بھی لیا گیا لیکن بعد میں علامہ کو اس نام کی بجائے "بال جبریل" زیادہ موزوں لگا چنانچہ انہوں نے وہ نام کاٹ کر یہ نام لکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ کا دوسرا مجموعہ کلام " بال جبریل" جس میں اقبال نے دعائیہ انداز کچھ ہوں اپنایا ہے۔

نغمہ نو بہارا اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر [13]

---

[11] ایضا، ص، 162

[12] ایضا، ص، 122

[13] اقبال "بالِ جبریل" طبع چہارم، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، ایبٹ روڈ، لاہور، 1944، ص، 08

اگر نئی بہار کے نغمے میرے نصیب میں نہیں تو میرے ادھ جلے سانس ہی کو بہار کی آمد کی خوش خبری دینے والا پرندہ بنا دے یعنی میں نے اپنی عمر ملتِ اسلامیہ کو اس کی عظمت ماضی کی طرف لانے کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اگر اس کی عظمت و سربلندی کی بہار میرے نصیبوں میں نہیں لکھی تو اے پروردگار! اپنے فضل و کرم سے مرے وجود ہی کو اس سربلندی اور عروج کی تمہید بنا دے:

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طلب یہ بندہ آزاد!
یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذّت ایجاد!
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل!
یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟
قصور وار، غریب الدّیار ہوں، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستان کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد![14]

[14] ایضا، ص10

اے اللہ ! میں تیری بارگاہ میں فریاد کر رہا ہوں میری فریاد اثر کرے یا نہ کرے لیکن اسے سن تو لے۔ واضح رہے تیرا یہ آزاد بندہ انصاف نہیں چاہتا۔ تو صرف میری فغان کو سن لے۔ ایک طرف تو یہ خاک کی مٹھی یعنی انسان ہے اور دوسری طرف اس کے لیے دنیا میں بلاؤں اور مصیبتوں کے جھکڑ ہیں۔ جو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ جھکڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا کے دکھ، غم حادثے بے شمار ہیں۔ میں کیا عرض کروں کہ اے خدا تو نے یہ چیزیں پیدا کر کے لطف اور مہربانی کی ہے۔ یا ان سے تیرے قہر و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان تو صرف ایک مشتِ غبار کمزور اور بے حیثیت چیز ہے وہ دنیا کی آفتوں اور جان لیوا پریشانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بے شک بہار نے پھول پیدا کیے۔ باغ میں اس قدر تیز ہوا چلتی ہے کہ ہوا میں پھولوں کا خیمہ قائم نہ رہ سکا چند ہی روز میں کلیاں پھوٹیں، کھلیں اور مر جا گئیں۔ اب تو ہی فرما کہ اسے فصلِ بہار کہیں یا اسے بادِ مراد سمجھیں؟ اسی طرح انسانی زندگی بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اے اللہ ! بے شک میں قصوروار، گناہگار اور پردیسی ہوں، جسے کہیں سے اٹھا کر یہاں بھیج دیا گیا۔ پردیسی اس لیے کہا گیا کہ ابلیس کے بہکاوے میں آدم آ گیا۔ جس کے نتیجے میں اسے دنیا میں بھیج دیا گیا۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کا ویرانہ تیرے فرشتے آباد نہ کر سکے اسے میں نے ہی آباد کیا اور گل و گلزار بنایا۔ انسانوں کو فرشتوں پر فضلیت حاصل ہے۔ کیونکہ دنیا کی رونق اور چہل پہل انسانوں ہی کے دم قدم سے ہے۔ یہ دنیا آنی فانی ہے اور اسے پائیداری نصیب نہیں، میرے وجود سے پہلے ایک چٹیل میدان تھی ۔ میری ہی محنت و مشقت سے اس میں رونق اور چہل پہل پیدا ہوئی یعنی انسان ہی کی بدولت یہ ہوا۔ انسان نے جہاں کی آرائش کو چار چاند لگائے اور اسی لیے یہ مجھے دعائیں دے رہی ہیں۔

میری طبیعت کو خطرے پسند ہیں۔ میں آفتوں، بلاؤں اور مصیبتوں میں خوش رہتا ہوں۔ مجھے وہ باغ ہر گز پسند نہیں، جہاں کوئی شکاری گھات لگائے نہ بیٹھا ہو یعنی میں نے ہمتِ مردانہ سے ہر قسم کے خطرات قبول کیے اور اس دنیا کی رونق کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ عشق و عاشقی تیرے فرشتوں کے بس کی بات نہیں اس کھٹن کام کو وہی کر سکتے ہیں جن میں ہمت اور حوصلہ بہت زیادہ ہے۔ انسان بہت حوصلہ مند مخلوق ہے۔ اسی نے دنیا کو سنوارنے کا کارنامہ سر انجام دیا۔ فرشتے سراپا خیر ہیں۔ انسان میں شر اور خیر دونوں موجود ہیں۔ شر کی

قوتوں پر غالب آکر خیر کی قوتوں کے ذریعے کسی بلند مقام تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔جو انسان نے سر انجام دیا۔

ضرب کلیم مئی 1936ء میں علامہ مرحوم کی وفات سے دو سال پہلے، پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔اب تک اس کتاب کے سات ایڈیشن ہو چکے ہیں اور ان کے مجموعی نسخوں کی تعداد انتیس ہزار کے قریب ہیں۔اگر ہم اس کی تعداد کا جاوید نامہ یا زبور عجم کے مطبوعہ نسخوں کی تعداد سے موزانہ کریں تو بظاہر یہ معلوم ہو گا کہ ضرب کلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن اگر اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مضامین کی بلندی کو مدِ نظر رکھا جائے تو ہمیں ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑے گا، کہ جس قوم کے لیے مرحوم نے یہ گہرہائے آبدار نظم کیے تھے، اس نے ابھی تک ان موتیوں کی قدر نہیں پہچانی۔ ضرب کلیم میں علامہ اقبال کے دعائیہ اشعار کچھ یوں ہیں:

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملّت کی زندگی کا پیام[15]

میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان کے اماموں کو وہ سجدہ نصیب کرے جس میں قوم اور ملّت کے لیے زندگی کا پیغام موجود ہو۔یعنی جس سے ملت زندہ ہو جائے۔اللہ تعالی نے اقبال کی دعا قبول فرمائی 1947ء کو پاکستان معروض وجود میں آگیا۔پھر اقبال ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[16]

---

[15] اقبال، "ضربِ کلیم" مسعود پبلشرز، حیدرآباد، دکن، س،ن، ص،162

اس نظم میں اقبال نے نماز کی اہمیت اور حقیقت بیان کی ہے۔یعنی اگر مسلمان سچے دل سے خدا پرستی اختیار کرلے تو وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔اگر چہ آدمی کو وجود میں آئے ہوئے لاکھوں کروڑوں سال ہو چکے ہیں۔اور وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔لیکن غیر خدا بتوں کی شکل میں بھی موجود ہے۔صرف ان کے نام بدلے اور شکلیں بدلی ہیں۔یہ لات و منات انسان کے بڑھاپے کے مقابلے میں بہت جوان ہیں۔ وہ زمانے میں بھیس بدل کر آتے رہتے ہیں۔ یہ بت پتھر کے نہیں ہیں بلکہ اور طرزوں کے ہیں مثلاً حوس ،حاکمیت و اقتدار زرو زن ،حرص اور کئی قسم کے دوسرے بتوں کے آگے انسان کو اپنی مادی ضروریات اور حصول رزق کی خاطر ان کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔یہ وہ دلفریب ہیں جو مسلمان کو صراط مستقیم سے ہٹانے میں مصروف رہتے ہیں۔اور اس طرح وہ اپنے حقیقی مالک وخالق اور رازق سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

وہ ایک سجدہ جو تجھے بوجھل محسوس ہوتا ہے۔یہ تجھے ہزار ہا دوسرے سجدوں سے نجات دلاتا ہے تجھے فانی خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے سے نجات مل جائے گئی۔ایک سجدہ کے معنی ہیں صرف ایک خدا کو سجدہ کرنا۔ اس بات کو اقبال نے ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے:

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے[17]

غیرت مند مسلمان ہمیشہ ہر کام میں اپنی نظر اپنے اللہ کی طرف رکھتا ہے۔غیر اللہ کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔وہ موت سے نہیں ڈرتا۔اس کے لیے موت تو مادی دنیا سے اٹھ کر روحانی دنیا میں جانے کا سفر ہے۔جس کے لیے مومن ہر وقت تیار رہتا ہے۔یہ حقیقی اور اصلی گھر صرف واپس جانے کا نام ہے۔ حقیقی اور اصلی زندگی صرف دارِ آخرت ہے۔اقبال طالبِ علم کے لیے بھی کچھ مختلف قسم کے جزبات رکھتے ہیں۔جو کچھ یوں ہیں:

---

[16] ایضا،ص،32

[17] اقبال،"بانگِ درا"ص،72

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراق کہ تو
کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں[18]

اے حصول تعلیم میں مصروف نوجوان تیرے لیے میری یہی دعا ہے کہ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کیوں کہ تم ایک ایسے سمندر کی مانند ہو جس کی لہروں میں کوئی تڑپ اور بے قراری نظر نہیں آتی۔اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اپنی مہربانی سے تیرے دل میں تڑپ پیدا کر دے۔تجھے کتابیں پڑھنے سے فرصت نہیں تو کتابی کیڑا بنا ہوا ہے۔تو کتاب پڑھتا ضرور ہے پر تجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں۔

تو "کتاب خواں" تو بن گیا ہے مگر "صاحب کتاب" نہ بن سکا۔"صاحب کتاب" اس نظم کی جان ہے۔اصطلاح میں "صاحب کتاب" اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اللہ کی طرف سے کوئی کتاب نازل ہو۔یہاں اس کے مجازی معنی مراد لیے گئیے ہیں۔یعنی ایسا شخص جس نے اپنے دل کو ایسا پاک وصاف کر لیا ہو کہ خدا تعالی اس پر فیضان سماوی نازل فرمائے۔اور یہ نعمت اس وقت ہی حاصل ہوتی ہے جب مرد مومن خدا سے رابطہ قلبی پیدا کر لے۔

انسان افرینش سے ہی مذہب اور عقائد سے وابستہ ہے۔مذہب کا مقصد صرف خدائے بزرگ کو برتر کی پراستش نہیں بلکہ انفرادی طور پر باطنی قوت بھی مقصود ہے۔جس کی وجہ سے فرد کا کردار معاشرے میں مثبت صورت میں نمودار ہوا۔دعا ہر عقیدے کا اہم پہلو ہے۔فرد بے چینی و بے قراری کی عالم میں طالب تسکین ہوتا ہے۔اس طرح کی کیفیت میں جب وہ اپنے رب کو پکارتا ہے تو اسی کا نام دعا ہے۔دعا کے معنی اپنے رب کو پکارنا اور اسے ہم کلام ہونا کے ہے

[18] اقبال، "ضربِ کلیم" ص، 11

خدا سے ہم کلامی کے وقت میں جو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔خدا کے قرب میں ڈوب کر التجا کی جاتی ہے تو عشق کی شمع تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے دعا کی فکری بنیاد بندے اور خالق کے مضبوط تعلق پر مبنی ہے یہ تعلق اطمینانِ قلب کا باعث بنتا ہے اور بہت سے ممکنہ مسائل کا حل بھی نکلتا ہے۔ جنہیں بعض اوقات ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ربِ کریم کی بے حد رحمت و فضل سے انسان یہ سیکھتا ہے کہ وہ اپنا رابطہ رب سے مضبوط رکھے اور اس کی رضا کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے۔ اسی رابطے اور تعلق کا اصل نام دعا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اللہ کے حضور دعا مانگنے کی تلقین کی ہے۔ اس نے اپنے شعری کلام میں دعا کے لیے مختلف استعارے مثلاً نالہ بے باک، آہ صبح گاہی، اشک سحر گاہی، گریہ نیم شب وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ ان کی دعاوں میں محبت، عشقِ حقیقی تک رسائی کے علاوہ مسلم امہ کے روشن مستقبل کے لیے دعائیں بھی اقبال کی خاصیت ہیں ۔اس کے علاوہ ان کے کلام میں اسلاف کے ماضی کے از سر نو زندہ ہونے کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعا نے اپنے اظہار کے لیے مختلف اصناف کا سہارا لیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ موضوع اپنے منفرد انداز میں چمکتا رہے گا اور دعاؤں کے خوش رنگ پھول کھلتے رہیں گے۔